نظرِ ثانی کے متعلق سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ

محمد مشتاق احمد*

سپریم کورٹ کے دس رکنی بنچ نے ۱۹ جون ۲۰۲۰ء کو جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب کے خلاف ریفرنس کو خارج کر دیا تھا۔ تاہم ان دس جج صاحبان میں سات جج صاحبان نے ایف بی آر کو جسٹس صاحب کی اہلیہ اور بچوں کے ٹیکس کا معاملہ دیکھنے کا حکم دیا تھا۔ دس رکنی بنچ کے اس فیصلے کے خلاف جب نظرِ ثانی کی درخواستیں دائر کی گئیں تو ابتدا میں ان کی سماعت کے لیے چھ رکنی بنچ تشکیل دیا گیا اور اس کی وجہ یہ ذکر کی گئی کہ تین جج صاحبان نے تو اختلافی نوٹ لکھا تھا اور ایک جج صاحب اس دوران میں ریٹائر ہوگئے ہیں۔ اس بنچ پر کئی اعتراضات وارد ہوئے جن میں ایک یہ تھا کہ جب پورا کیس دس جج صاحبان نے سنا تھا تو نظرِ ثانی بھی دس جج صاحبان کو ہی کرنی چاہیے تھی اور اس لیے اختلافی نوٹ لکھنے والے تین جج صاحبان کو بھی اس بنچ میں ہونا چاہیے تھا اور ریٹائر شدہ جج صاحب کی جگہ ایک اور جج کو بٹھایا جانا چاہیے تھا۔ مزید یہ کہ اگر ایک لمحے کے لیے مان بھی لیا جائے کہ نظرِ ثانی تو "فیصلے" کے خلاف ہوتی ہے اور فیصلے کی حیثیت یا تو متفقہ فیصلے کو حاصل ہوتی ہے یا اکثریتی فیصلے کو، تو سوال یہ ہے کہ سات رکنی بنچ کے فیصلے پر چھ رکنی بنچ کیسے نظرِ ثانی کر سکتا ہے؟

۲۲ فروری ۲۰۲۱ء کو اس چھ رکنی بنچ نے ان سوالات اور دیگر متعلقہ سوالات پر اپنا فیصلہ سنادیا جو اس نے دسمبر میں محفوظ کیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود یہ بنچ بھی تقسیم ہوگیا ہے اور پانچ جج صاحبان نے اکثریتی فیصلہ سنایا ہے، جبکہ ایک جج صاحب نے اکثریتی فیصلے کے ایک نکتے سے اتفاق کرتے ہوئے باقی نکات سے اختلاف کیا ہے۔ ہم پہلے اسی اکثریتی فیصلے پر تبصرہ پیش کریں گے۔ اس کے بعد جسٹس منظور اے ملک کے الگ فیصلے کا جائزہ لیں گے۔

اہم نتائج

جسٹس عمر عطا بندیال صاحب نے اکثریتی فیصلہ لکھا ہے جس کی رو سے نتیجہ یہ نکلا ہے کہ:

۱. نظرِ ثانی کی سماعت میں ججز کی تعداد کم از کم اتنی ہونی چاہیے جتنی اصل بنچ میں تھی، یعنی اختلافی نوٹ لکھنے والے جج صاحبان کی تعداد کو بھی اس میں شامل مانا جائے گا؛ اس تعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے لیکن کم از کم اتنی تعداد کا ہونا ضروری ہے۔ (اس وجہ سے جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کیس میں نظرِ ثانی کی سماعت کے لیے کم از کم دس رکنی بنچ تشکیل دینا ضروری ہوگیا۔)

---

* ایسوسی ایٹ پروفیسر قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد mushtaqahmad@iiu.edu.pk۔

۲. نظرِ ثانی کے بنچ میں کون ہو اور کون نہ ہو، یہ بنیادی طور پر چیف جسٹس کے تمیزی اختیارات (discretionary powers) میں آتا ہے لیکن اس بنچ میں اس جج کو ضرور ہونا چاہیے جس نے متفقہ یا اکثریتی فیصلہ لکھا ہے۔ اگر متفقہ یا اکثریتی فیصلہ لکھنے والا جج میسر نہ ہو، تو ان جج صاحبان کو بنچ میں ہونا چاہیے جنھوں نے اس متفقہ یا اکثریتی فیصلے سے اتفاق کیا ہو۔

۳. چیف جسٹس چاہیں تو نظرِ ثانی کے بنچ میں ججز کی تعداد اصل بنچ کے ججز کی تعداد سے بڑھا بھی سکتا ہے۔

ان تینوں اصولوں کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جسٹس بندیال صاحب نے نظرِ ثانی کے بنچ میں اپنی پوزیشن تو مستحکم کرلی، ساتھ ہی اپنے ساتھ اتفاق کرنے والے جج صاحبان کو شامل کرنے کے لیے بھی راہ ہموار کرلی، لیکن اختلافی نوٹ لکھنے والے تین جج صاحبان کی جگہ تین دیگر جج صاحبان کو شامل کرنے، یا انھی تین کے ساتھ چند اور جج صاحبان کو شامل کرنے، کی گنجائش بھی پیدا کرلی!

۴. اختلافی نوٹ لکھنے والے جج صاحبان اگر نظرِ ثانی کے بنچ میں شامل بھی ہوں تو انھیں بہت زیادہ برداشت کا مظاہرہ کرنا ہوگا تاکہ وہ اکثریتی جج صاحبان پر اثرانداز نہ ہوں۔

اس بات کو جسٹس بندیال کی جانب سے جسٹس منصور علی شاہ، جسٹس مقبول باقر اور جسٹس یحیٰ آفریدی کو کنٹرول کرنے کی کوشش کے طور پر دیکھا گیا۔

"چیف جسٹس کی مرضی؟"

بنچ بنانے کے اختیار کو چیف جسٹس کی مرضی پر منحصر کرنے کے لیے جسٹس بندیال کے استدلال کی بنا سپریم کورٹ رولز پر ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سپریم کورٹ کو نظرِ ثانی کا اختیار دستور کی دفعہ ۱۸۸ کے تحت حاصل ہے لیکن اس اختیار کے متعلق دستور کی اس دفعہ میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ اس اختیار کو پارلیمان کے بنائے گئے قانون یا سپریم کورٹ کے بنائے گئے رولز کے تحت استعمال کیا جائے گا۔ اس دفعہ کے تحت پارلیمان کو باقاعدہ قانون سازی کرنی چاہیے تھی لیکن اس نے ابھی تک یہ فریضہ ادا نہیں کیا۔ البتہ سپریم کورٹ نے رولز بنائے ہیں۔ چنانچہ جسٹس بندیال کے پورے فیصلے کا انحصار اس بات پر ہے کہ سپریم کورٹ رولز اس معاملے میں حتمی اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پتہ نہیں کیوں وہ اس بات کو نظرانداز کرگئے ہیں کہ ہمارے قانونی نظام کی رو سے رولز کو ضمنی قانون کی حیثیت حاصل ہے جو پارلیمان کے بنائے گئے قانون کے ماتحت ہوتے ہیں اور پارلیمان کا بنایا گیا

قانون دستور کے ماتحت ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر پارلیمان نے اس ضمن میں کوئی قانون نہیں بنایا، تب بھی یہ رولز دستور کے ماتحت ہی ہیں اور ان کو دستور پر بالاتر حیثیت حاصل نہیں ہے۔ یہ بات قانون کے عمومی قواعد کی رو سے بھی واضح تھی اور اس بات کی تصریح آگے دستور کی دفعہ ۱۹۱ میں بھی کی گئی ہے جس میں صراحتاً قرار دیا گیا ہے کہ "دستور اور قانون کے ماتحت" (Subject to the Constitution and law) سپریم کورٹ اپنی پریکٹس اور طریقِ کار کے لیے رولز بنا سکتی ہے۔ کیا یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ دستور کی دفعہ ۱۸۸ میں مذکور نظرِ ثانی کے اختیار کو تو انھوں نے سپریم کورٹ کے رولز کے ماتحت قرار دیا لیکن خود سپریم کورٹ کے رولز کو دستور اور قانون کے ماتحت ہونے کے پہلو سے نہیں دیکھا؟

بہرحال سپریم کورٹ رولز کو حتمی اتھارٹی مان کر انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ بنچ بنانے، بنچ میں ججز کی تعداد مقرر کرنے، بنچ میں کون ججز ہوں اور کون نہ ہوں، ان سارے امور کے متعلق اختیارات چیف جسٹس کو حاصل ہیں کیونکہ وہ "ماسٹر آف روسٹر" کی حیثیت رکھتے ہیں! یہ اصول طے کرنے کے بعد ان کے سامنے یہ سوالت آئے کہ نظرِ ثانی کے بنچ میں کتنے اور کون سے جج ہونے چاہئیں؟ ان کا جواب تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ "چیف جسٹس کی مرضی" لیکن چونکہ سپریم کورٹ رولز کے آرڈر ۲۶، رول ۸ میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو (as far as practicable) نظرِ ثانی کی سماعت "وہی بنچ" (the same bench) کرے گا جس نے اصل فیصلہ یا حکم سنایا ہو، اس لیے انھیں اس بحث میں جانا پڑا کہ "جہاں تک ممکن ہو" سے مراد کیا ہے اور "وہی بنچ" کا مفہوم کیا ہے؟ اہم بات یہ ہے کہ چونکہ نظرِ ثانی کے رولز کو "قانون اور سپریم کورٹ کی پریکٹس" کے ماتحت کیا گیا ہے (آرڈر ۲۶، رول ۱)، اس لیے جسٹس صاحب کو سپریم کورٹ کی پریکٹس کا بھی جائزہ لینا پڑا۔ جیسا کہ پیچھے ذکر کیا گیا، انھوں نے نتیجہ تو دونوں سوالات کا یہ نکالا کہ "مرضی چیف جسٹس کی" لیکن ان کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کے طور پر ذوالفقار علی بھٹو کیس کا نظرِ ثانی کا فیصلہ حائل ہو گیا۔

بھٹو کیس کی رکاوٹ

بھٹو کیس میں سات رکنی بنچ نے سزاے موت کے خلاف اپیل کی سماعت کی تھی جس کے بعد تین جج صاحبان نے اپیل منظور کی لیکن چار جج صاحبان نے سزاے موت برقرار رکھی۔ اس فیصلے کے بعد جب نظرِ ثانی کی درخواست دائر کی گئی تو اس درخواست کی سماعت تمام سات جج صاحبان نے کی۔ یہ الگ بات ہے کہ نظرِ ثانی کی درخواست مسترد کرنے پر ساتوں جج صاحبان نے اتفاق کیا، لیکن اہم بات یہ ہے کہ بنچ میں اختلاف کرنے والی اقلیت بھی شامل تھی۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ یہ فیصلہ ۱۹۷۹ء کا ہے جبکہ سپریم کورٹ رولز ۱۹۸۱ء میں بنائے

گئے اور ان میں تصریح کی گئی تھی کہ نظرِ ثانی کے رولز "قانون اور سپریم کورٹ کی پریکٹس" کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ ۱۹۷۹ء کی یہ پریکٹس ان رولز پر حاوی بھی ہے، ورنہ رولز کی تعبیر تو جسٹس بندیال نے ایسی کرلی تھی کہ سارا معاملہ ہی چیف جسٹس کی مرضی پر منحصر ہو گیا تھا۔ ۱۹۷۹ء کی اس پریکٹس کو منسوخ کرنے یا ناقابلِ اتباع قرار دینے کا راستہ بھی بند تھا کیونکہ مذکورہ بنچ سات ججز پر مشتمل تھا جس کے فیصلے سے انحراف کے لیے سات سے زائد ججز پر مشتمل بنچ درکار تھا، جبکہ موجودہ بنچ چھ ارکان پر مشتمل تھا۔ چنانچہ خواہی نخواہی، جسٹس بندیال صاحب کو ماننا پڑا کہ نظرِ ثانی بنچ میں اختلافی نوٹ لکھنے والے جج صاحبان کی تعداد بھی شامل ہونی چاہیے۔ یہ بات البتہ مد نظر رہے کہ انھوں نے تعداد ہی کی بات کی ہے، یعنی اگر سات ججز نے مقدمہ سنا تو نظرِ ثانی بھی سات ہی کریں، اور دس نے مقدمہ سنا تو نظرِ ثانی بھی دس ہی کریں، لیکن وہ سات یا دس جج کون ہوں، یہ فیصلہ چیف جسٹس نے کرنا ہے کیونکہ وہ "ماسٹر آف روسٹر" ہیں!

کیا رول ۸ کی یہ تعبیر مناسب ہے کہ اس میں "وہی بنچ" سے مراد صرف "ججز کی وہی تعداد" ہے؟ کم از کم سپریم کورٹ کی پریکٹس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعبیر درست نہیں ہے۔ نظرِ ثانی میں ہمیشہ کوشش یہ کی گئی ہے کہ صرف تعداد ہی اتنی نہ ہو بلکہ ججز بھی وہی ہوں، الا یہ کہ کسی وجہ سے کوئی جج صاحب شریک نہ ہو سکتے ہوں (جیسے مثلاً وہ ریٹائر ہو گئے ہوں)۔ چنانچہ اسی استثنائی امکان کے لیے رول ۸ میں "جہاں تک ممکن ہو" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ بھٹو کیس میں بھی یہی ہوا تھا کہ چونکہ ساتوں جج صاحبان دستیاب تھے، اس لیے انھی سات جج صاحبان پر مشتمل بنچ نے نظرِ ثانی کی سماعت کی۔ تاہم جسٹس بندیال نے "جہاں تک ممکن ہو" کی ایسی عجیب تعبیر کی کہ یہ معاملہ بھی چیف جسٹس کی مرضی پر معلق کر دیا اور فرمایا کہ چونکہ چیف جسٹس "ماسٹر آف روسٹر" ہے، اس لیے اسے انتظامی اور دیگر مسائل کو بھی مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے اور اس لیے اس معاملے میں حتمی فیصلہ چیف جسٹس کا ہی ہو گا! بھٹو کیس سے انحراف تو وہ کر نہیں سکتے تھے لیکن اسے کمزور کرنے کی عجیب کوشش انھوں نے یہ کی کہ قرار دیا کہ چونکہ اس وقت سپریم کورٹ میں سات ہی جج صاحبان باقی تھے، اس لیے "جہاں تک ممکن ہو" میں اس کے علاوہ کوئی امکان باقی نہیں تھا کہ وہی سات جج صاحبان اس کی سماعت کریں! بہ الفاظِ دیگر، اگر کوئی اور جج ہوتے تو یہ ممکن ہوتا کہ اس بنچ میں ان کو شامل کیا جاتا۔ یہ محض مفروضہ ہی ہے اور محض مفروضے پر کیسے اتنی بڑی عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے؟ میرے نزدیک پیرا ۲۶۱، جہاں جسٹس صاحب نے یہ عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے، اس فیصلے کا کمزور ترین پیرا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پریکٹس، کہ نظرِ ثانی میں وہی جج شامل ہوں جنھوں نے اصل مقدمے کی سماعت کی تھی، الا یہ کہ وہ ریٹائر ہو گئے ہوں یا کسی اور وجہ سے ان کی شمولیت ممکن نہ ہو، ۱۹۸۱ء کے رولز

کے بعد بھی مسلسل جاری رہی ہے۔ مثلاً ۱۹۹۹ء میں ربا کے بارے میں سپریم کورٹ کے پانچ رکنی شریعت اپیلیٹ بنچ نے اپیل کی سماعت کی (اگرچہ فیصلہ لکھتے وقت اس میں چار باقی رہ گئے تھے)۔ پھر جب ۲۰۰۲ء میں نظرِ ثانی کی سماعت ہوئی، تو اس وقت تک جسٹس وجیہ الدین احمد اور جسٹس خلیل الرحمان خاں کو پی سی او کے تحت حلف نہ اٹھانے کی بنا پر برطرف کیا گیا تھا، جبکہ مولانا تقی عثمانی صاحب کا کنٹریکٹ ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ بنچ کے صرف ایک رکن جسٹس منیر اے شیخ رہ گئے تھے۔ ان کے ساتھ چار دیگر ججز کو شامل کر کے پانچ رکنی بنچ تشکیل دیا گیا اور اس بنچ سے نظرِ ثانی کروائی گئی۔ اسی طرح پاناما کیس میں میاں نواز شریف کے خلاف ۲ جج صاحبان نے فیصلہ سنایا اور ۳ نے جے آئی ٹی کی تشکیل کا کہا۔ بعد میں جب نظرِ ثانی کا موقع آیا تو پانچ رکنی بنچ ہی تشکیل پایا اور اس میں اقلیتی ۲ جج بھی شامل تھے اور اکثریتی ۳ جج بھی۔ مزید اہم بات یہ ہے کہ پانچوں "وہی جج صاحبان" تھے جنھوں نے اصل کیس کی سماعت کی تھی، یعنی بات صرف تعداد پوری کرنے تک ہی محدود نہیں رہی تھی۔

اختلافی آواز کو خاموش کرنے کی کوشش؟

اس ساری بحث سے معلوم ہوا کہ اگر بھٹو نظرِ ثانی کیس کا فیصلہ سامنے نہ ہوتا، تو شاید جسٹس بندیال صاحب یہاں تک لکھ دیتے کہ نظرِ ثانی صرف اکثریتی فیصلہ لکھنے والے یا اس کی حمایت کرنے والے جج صاحبان ہی کریں گے لیکن چونکہ بھٹو کیس میں ایسا نہیں ہوا تھا، اس لیے انھوں نے مجبوراً یہ مان لیا کہ تعداد کے لحاظ سے بنچ اتنے ہی جج صاحبان پر مشتمل ہو جتنے جج صاحبان نے اصل کیس کی سماعت کی، خواہ بعد میں وہ فیصلے پر تقسیم ہو گئے ہوں۔ یاد کیجیے کہ وہ پہلے ہی قرار دے چکے ہیں کہ نظرِ ثانی سپریم کورٹ کے فیصلے پر ہوتی ہے اور "سپریم کورٹ کے فیصلے" کی حیثیت متفقہ یا اکثریتی فیصلے کو ہی حاصل ہے کیونکہ صرف وہی فیصلہ قابلِ تنفیذ ہوتا ہے۔ جسٹس بندیال کے فیصلے کا یہ حصہ بھی بہت کمزور ہے اور انھوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اس پہلو پر الگ سے تفصیلی بحث ہونی چاہیے۔

ہم بھی اس پہلو کو سر دست نظرانداز کر کے آگے ان باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں جو انھوں نے اس کمزور بات کو بنیاد بنا کر کی ہیں۔ ان میں دو باتیں بہت اہم ہیں:

ایک یہ کہ اگرچہ بنچ کی تشکیل اور اس میں مخصوص جج صاحبان کی موجودگی کا فیصلہ چیف جسٹس کی مرضی پر منحصر ہے لیکن اس مرضی سے ایک استثنا موجود ہے؛ یعنی چیف جسٹس چاہیں یا نہ چاہیں، وہ جج صاحب تو اس بنچ میں ضرور ہوں گے جنھوں نے متفقہ یا اکثریتی فیصلہ لکھا۔ اگر وہ نہ ہوں، تو پھر ان ججز میں کوئی ضرور ہوں جنھوں نے اس متفقہ یا اکثریتی فیصلے سے اتفاق کیا۔

دوسری یہ کہ اگر چیف جسٹس اختلافی نوٹ لکھنے والے جج صاحبان کو بنچ میں شامل بھی کرلیں تو ان جج صاحبان کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ وہ زیادہ سے زیادہ تحمل کا مظاہرہ کریں اور اکثریتی جج صاحبان پر اثرانداز نہ ہوں۔ اس ضمن میں انھوں نے جسٹس دوراب پٹیل کے فیصلے سے ایک حصہ نقل بھی کیا ہے۔ جسٹس پٹیل ان تین جج صاحبان میں تھے جنھوں نے بھٹو کی اپیل منظور کی تھی۔ (جسٹس بندیال کے فیصلے میں یہاں ایک دلچسپ کتابت کی غلطی بھی ہے کیونکہ یہاں قرار دیا گیا ہے کہ وہ اس تین رکنی اقلیت میں تھے جس نے بھٹو کی اپیل مسترد کی تھی!)

کیا اس طرح جسٹس بندیال نے جسٹس منصور علی شاہ، جسٹس مقبول باقر اور جسٹس یحیٰ آفریدی کو خاموش کرنے کی کوشش کی ہے؟ واضح رہے کہ یہ ایک ضمنی بات تھی اور اس پر مقدمے کے فریقوں کی جانب سے کوئی خاص گفتگو بھی نہیں کی گئی تھی (کم از کم ایسی کسی گفتگو یا دلائل کا حوالہ جسٹس بندیال نے نہیں دیا)۔ اس لیے اس نکتے کی حیثیت محض ایک passing remark یا obiter dictum کی ہے لیکن یہ بات دیکھنے کی ہے کہ اس obiter dictum کے لیے جسٹس بندیال نے تین صفحات مختص کیے!

جسٹس منظور اے ملک کا فیصلہ

بظاہر اس افسوسناک فیصلے میں ایک روشن پہلو یہ سامنے آیا ہے کہ جسٹس بندیال اس چھ رکنی بنچ کو، جس کی وہ سربراہی کررہے تھے، اختلاف سے نہ روک سکے۔ چنانچہ بنچ کے ایک رکن جسٹس منظور اے ملک نے ان کے فیصلے کے صرف اس ایک نکتے سے ہی اتفاق کیا کہ نظرِ ثانی کے بنچ میں ججز کی تعداد اتنی ہی ہوگی جتنی اصل کیس کی سماعت میں تھی، خواہ فیصلہ متفقہ ہو یا اکثریتی۔ دیگر نکات پر وہ متفق نہیں ہوسکے۔ انھوں نے اپنا تفصیلی فیصلہ ۲۸ اپریل ۲۰۲۱ء کو جاری کیا۔ یاد رہے کہ اس سے دو دن قبل ۲۶ اپریل ۲۰۲۱ء کو نظرِ ثانی کا فیصلہ بھی سنایا گیا اور اس میں جسٹس منظور اے ملک اور جسٹس مظہر عالم میاں خیل نے اپنے سابقہ فیصلے سے رجوع کرکے جسٹس مقبول باقر، جسٹس سید منصور علی شاہ اور جسٹس یحیٰ آفریدی کے ساتھ اتفاق کیا۔ نیز اس دوران میں جسٹس فیصل عرب ریٹائر ہوگئے تھے اور ان کی جگہ نظرِ ثانی بنچ میں تعداد پوری کرنے کے لیے جسٹس امین الدین خان کو شامل کیا گیا۔ انھوں نے بھی ان پانچ ججز کے ساتھ اتفاق کیا۔ یوں سابقہ فیصلے کی حمایت میں صرف ۴ جج رہ گئے اور ۴ کے مقابلے میں ۶ کی اکثریت سے فیصلہ مسز درخواست گزاروں کے حق میں ہوگیا۔ اس فیصلے کے ۲ دن بعد جسٹس ملک نے نظرِ ثانی بنچ کے متعلق اپنا تفصیلی فیصلہ سنایا اور اس کے ۲ دن بعد ۳۰ اپریل کو وہ ریٹائر ہوگئے۔ ۱۰ صفحات پر مشتمل جسٹس منظور اے ملک کا یہ فیصلہ بہت اہم ہے اور

اگر یہ نظرِ ثانی کے فیصلے سے قبل جاری کیا جاتا تو شاید پہلے ہی سے واضح ہو چکا ہوتا کہ نظرِ ثانی کے فیصلے میں وہ کہاں کھڑے ہوں گے لیکن شاید انھوں نے سسپنس باقی رکھنا مناسب سمجھا۔

جسٹس ملک نے نظرِ ثانی کے متعلق قواعد کا جائزہ لینے کے بعد ایک تو یہ نتیجہ نکالا کہ اس بنچ میں صرف ججز کی تعداد کا پورا کرنا ہی ضروری نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہی ججز اس کی سماعت کریں جنھوں نے اصل فیصلہ سنایا تھا، الا یہ کہ ان کا سماعت میں شریک ہونا ممکن نہ رہے۔ انھوں نے جسٹس بندیال کی اس دلیل کو بھی مسترد کردیا کہ بھٹو نظرِ ثانی کیس میں وہی جج اس لیے بیٹھ گئے تھے کہ سپریم کورٹ میں کوئی اور جج تھے ہی نہیں۔ اس کے خلاف انھوں نے نظرِ ثانی کے متعلق کئی نظائر پیش کیے جن سے اس بات کی غلطی واضح ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ اہم ان کے اس فیصلے کا وہ حصہ ہے جس میں وہ اختلافی رائے رکھنے والے ججز کو تحمل سے کام لینے کو ججز کی آزادی اور ان کے اختیارات کو محدود کرنے اور انھیں متاثر کرنے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ جسٹس بندیال نے تحمل اور خاموشی کے لیے استدلال کرتے ہوئے بھٹو کیس سے جسٹس دوراب پٹیل کا اقتباس پیش کیا تھا۔ جواب میں جسٹس منظور ملک اسی فیصلے سے جسٹس دوراب پٹیل کی رائے نقل کرکے دکھاتے ہیں کہ جسٹس دوراب پٹیل اصل فیصلے میں اختلافی رائے رکھتے تھے اور پھر نظرِ ثانی میں بھی انھوں نے کیس پر باقاعدہ اپنی رائے دی ہے۔

میرے نزدیک جسٹس منظور ملک کے اس فیصلے کا آخری پیراگراف بہت اہم ہے۔ جسٹس بندیال نے اپنے فیصلے میں مسلسل اس بات کا اعادہ کیا تھا کہ بنچ کی تشکیل چیف جسٹس کا اختیار ہے کیونکہ وہ "ماسٹر آف روسٹر" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جسٹس منظور ملک نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ماسٹر آف روسٹر" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب کچھ چیف جسٹس کی مرضی پر منحصر ہے۔ اس کے برعکس انھوں نے قرار دیا کہ اس مرضی کو اصول اور قواعد کے مطابق ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

****